قسط:۷

ورق ورق زندگی

پروفیسر خالد شبیر احمد

ملک اللہ دتہ مرحوم و مغفور چنیوٹ شہر کی جماعتِ احرار کے تاعمر صدر رہے۔ بلوچ قبیلہ سے تعلق تھا۔ انتہائی زیرک اور بہادر انسان تھے۔ اپنے دور کی پوری سیاسی تاریخ ان کے ذہن میں محفوظ تھی۔ کوئی اہم واقعہ ایسا نہیں تھا جو ان کی یادداشت سے باہر ہو۔ امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے انتہائی شیدائی اور عقیدت مند تھے، شاہ جی کے ساتھ خصوصی تعلقِ خاطر تھا۔ شاہ جی ملک صاحب کو اکثر بے تکلفی میں ''او چاچے دے دیا پُترا'' (اے چچا زاد بھائی) بھی کہتے تھے اور مزاحاً فرماتے کہ تم بلوچ ابوجہل کی اولاد ہو۔ مُلک کی غلامی کا انہیں انتہائی قلق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے تئیں یہ عہد کر رکھا تھا کہ جب تک ملک آزاد نہیں ہوگا وہ شادی نہیں کریں گے۔ پھر یہ عہد اُنہوں نے نبھایا بھی۔ اُن کی شادی ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ معروف قانون دان ملک رب نواز اُن کے بڑے بیٹے ہیں جو مارچ ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ جب کہ اس وقت ملک اللہ دتہ مرحوم جھنگ جیل میں تحریکِ ختمِ نبوت کے سلسلے قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے۔ ملک رب نواز ایڈووکیٹ نے اپنے والدِ بزرگوار کی پیروی میں اوائل عمری میں ہی اپنے آپ کو ناموسِ رسالت کے تحفظ کے لیے قید و بند کے حوالے کر دیا۔ اور بڑے حوصلے اور بہادری کے ساتھ جیل کاٹی۔ بعد میں ۱۹۷۴ء کی تحریک میں تو ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ ملک اللہ دتہ کی تربیت کا ہی کرشمہ تھا کہ وہ ایسے ہر امتحان میں کامیاب و کامران رہے جو اس راہ میں انہیں پیش آیا اور انتہائی صبر و استقامت کے ساتھ اپنے مؤقف کی صداقت پر ڈٹے رہے۔

ملک اللہ دتہ مرحوم کے علاوہ شہر میں مجلس احرار کے چند نمایاں رضا کاروں کے نام جو میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں، ذکر کرتا ہوں۔ ملک نذر محمد اعون سالار شہر شاہی منڈی میں ہی ان کی رہائش تھی۔ انتہائی بہادر اور شجاع، بلند قامت، خوش گفتار و خوش کردار۔ جیش کے سالار کی خصوصی وردی میں بڑے خوبصورت لگتے تھے۔ دیکھنے والے بس دیکھتے ہی رہ جاتے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی فوجی جنرل جماعت نے مستعار لے لیا ہو۔ شاہی منڈی سے متصل بازار تو مجلس احرار اسلام چنیوٹ کا مرکز تھا۔ سارے دکان دار جماعت احرار کے رضا کار تھے۔ کیتھ مٹھائی شاپ کے مالک نذر محمد کیتھ کی دکان تو جماعت احرار چنیوٹ کا ذیلی دفتر تھا۔ جہاں کوئی نہ کوئی احراری اکٹھ ہر وقت موجود رہتا۔ اور سیاست پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا۔ ان کے ساتھ دوسری دکان زمزم سوڈا واٹر فیکٹری محمد حسین کی تھی جو الٰہی بخش شہید کے داماد بھی

تھے اور جماعت کے ایک فعال کارکن، اور مولا بخش وسیر المعروف ''مولوتاجے دا'' کا ہوٹل بھی ساتھ ہی تھا۔ مولا بخش وسیر بڑا فعال اور مستعد احراری تھا جس کے تمام بیٹے جماعتِ احرار کے کارکن تھے۔ اس خاندان کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ اس کے تمام افراد جماعت کے فعال رضا کار تھے۔ ان کے چھوٹے دونوں بھائی اللہ دتہ اور فیروز دین، ان کے سارے بیٹے گلزار وسیر، شیر محمد وسیر، خوشی محمد وسیر، نذیر اور بشیر وسیر جماعت کے معروف کارکنوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ ایک ایسا کارکن جس کی شہرت حاضر جوابی اور پُر لطف باتوں کی وجہ پورے شہر میں ایک منفرد حیثیت حاصل کر گئی تھی وہ شیر محمد آزاد المعروف ''شیر و آزاد'' عموماً کیتھ مٹھائی شاپ پر نذر محمد کیتھ کے ساتھ ہی بیٹھتا تھا۔ موٹر ڈرائیور بھی تھا، پھر کنڈکٹری بھی کرتا رہا اور بس اڈے پر ہاکر بھی رہا۔ جن دنوں ہاکر تھا کسی نے پوچھا کہ شیر و آج کل کیا کرتے ہو، جواب تھا: ''بس اڈے پر آواز کلرک ہوں۔'' راہ چلتے اگر کسی نے پوچھ لیا کہ شیر و بال بچے کیسے ہیں؟ کہتا: ''میرے علاوہ سب خیریت سے ہیں۔'' شیر و بھرجائی کا کیا حال ہے؟ جواب ہوتا: ''قمیص کے بٹنوں سے اندازہ لگا لو' اب پوچھنے والے کی نظر قمیص کے بٹنوں پر پڑتی تو کوئی نیلے رنگ کے دھاگے سے اور کوئی کالے رنگ اور کوئی کسی دوسرے رنگ کے دھاگے سے لگا دیکھ کر پوچھنے والا ہنسی کو ضبط نہ کر پاتا۔ ایک دفعہ کسی (چنیوٹی شیخ برادری کے فرد کی جو بڑا پکا لیگی تھا اور عموماً نذر محمد کیتھ کی دکان پر آ کر احراریوں سے بحث کرتا رہتا تھا) کی بحث ''شیر و آزاد'' سے ہو رہی تھی اور اس شیخ نے شیر و آزاد سے کہہ دیا کہ ''یار سنا ہے مولانا ابوالکلام آزاد جو تمہارا لیڈر ہے وہ شراب پیتا ہے۔'' شیر و آزاد نے جواب میں کہا کہ ''شیخ صاحب میں نے سنا ہے کہ آپ کی اپنی بہو سے ناجائز تعلقات ہیں' وہ آگ بگولا ہو گیا۔ غصے میں شیخ صاحب نے جب یہ کہا کہ تمہیں کس اُلّو کے پٹھے نے یہ بات کہی ہے تو فوراً شیر و آزاد نے جواب میں کہا اسی اُلّو کے پٹھے نے جس نے آپ کو کہا تھا کہ ابوالکلام آزاد شراب پیتا ہے۔ وہ بڑبڑاتا اٹھ کر چلا گیا اور اس کے بعد اس شیخ کو شیر و آزاد سے کبھی بحث کی جرأت نہ ہوئی۔ ایک دفعہ بازار سے صبح کے وقت بڑا تیز تیز گزر رہا تھا کہ کسی نے پوچھا کہ شیر و آزاد آج کیا بات ہے صبح صبح بڑے تیز تیز بھاگے جا رہے تو جواب تھا: ''یار مجسٹریٹ کو ٹائم دیا ہوا ہے'' معلوم ہوا بس ڈرائیور کے طور پر چالان ہو گیا تھا مجسٹریٹ کے سامنے پیشی تھی۔

ظہور راج بڑے فعال کارکن تھے۔ مشکل وقت میں مشکل سے نکلنے کے لیے منصوبہ بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ عموماً اپنے ان لیڈروں کو جن کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوتے گرفتاری سے جلسہ کے بعد محفوظ رکھنا انہی کا کام ہوتا۔ پولیس ان کے اس کام کی وجہ سے ان سے ہمیشہ ناراض رہتی۔ جلسے کے اہتمام میں ظہور راج کا ہی بنیادی کردار ہوا کرتا۔ جماعت خلافِ قانون ہو گئی تو مجلس تحفظ ختم نبوّت کے کرتا دھرتا ہو گئے۔ وہ جلسہ جو مجلسِ احرار دسمبر میں ان تاریخوں میں کروایا کرتی تھی جب ربوہ (چناب نگر) میں قادیانیوں کا سالانہ جلسہ ہوتا تھا، ختم نبوت کے زیر اہتمام ہونے لگا۔ جس

میں ملک کے معروف علما شرکت کرتے لیکن شہر میں اکثر یہ کہا جاتا کہ امیر شریعتؒ کے ابناء کو اس جلسے میں کیوں نہیں بلوایا جاتا۔ جس کا ظہور راج کے پاس کوئی تسلّی بخش جواب نہ ہوتا۔ بہرحال ان کی جماعتِ احرار کے لیے خدمات قابلِ قدر ہیں۔ میاں غلام مرتضٰی راجھے بھی مجلس احرارِ اسلام کے ممتاز کارکنوں میں شمار ہوتے ہیں جو رشتے میں میرے سگے ماموں تھے۔

مولا بخش المعروف مولوتاجے دا کا ہوٹل مشہور جگہ تھی۔ جہاں ہر طرح کے لوگ حقّے کے ارد گرد بیٹھے رہتے اور ہر موضوع پر گفتگو بھی ہوتی۔ مولا بخش عام طور پر ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کیا کرتا تھا جس سے لوگ بڑے محظوظ ہوتے، سیاسی و مذہبی گفتگو بڑے بے تکلف انداز میں ہوتی۔ ہمارے محلے کے میونسپل کمشنر چوہدری محمد عظیم، ملک اللہ دتہ، فضل شاہ اور ''بھٹی'' کے سادات جو عموماً اثنا عشری تھے آ کر اس جگہ بیٹھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی اس محفل میں جا بیٹھتا۔ یہاں پر بھی اکثر احرار رہنماؤں کا ہی ذکر ہوتا اور تحریک پاکستان کی دیگر اہم سیاسی شخصیات اور ان کے اخباری بیانات پر تنقیدی بحث اکثر و بیشتر ہوتی۔ یہ جگہ سیاسی کارکنوں کے لیے ایک طرح کی تربیت گاہ تھی۔ جہاں سے میں اکثر و بیشتر بڑی اہم باتیں پلّے باندھ لیتا تھا۔ آج میں حیران ہوں کہ یہ تمام لوگ کوئی خاص پڑھے لکھے نہ تھے۔ لیکن عمومی بات چیت ایسی ہوا کرتی تھی کہ اشکال رفع ہو جاتے تھے اور یوں محسوس ہوتا کہ جیسے آدمی اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آ گیا۔ خاص طور پر ملک اللہ دتہ کی گفتگو انتہائی مؤثر ہوتی۔ بڑے بڑے لوگ ان کی بات سن کر تعجب کی کیفیت میں ڈوبے نظر آتے اور میں آج خود حیران ہوں کہ ایک ایسا آدمی جس کے پاس رسمی تعلیم برائے نام تھی کیسے اہم نکات پیش کیا کرتا تھا کہ جس کا کوئی جواب کسی دوسرے کے پاس نہیں ہوتا تھا۔

بات احرار رضا کاروں کی ہو رہی تھی، ظہور راج کے علاوہ کریم راج، میاں احسان الٰہی قصاب، عبدالحکیم، چوہدری محمد یوسف جن کے والد چوہدری عظیم محلے میں میونسپل کمشنر بھی تھے، شاہ جی سے عقیدت رکھتے تھے، شیخ اللہ دین صاحب ویرہ جن کے چھوٹے بھائی سالار محمد یوسف خاکسار تحریک کے سالارِ شہر تھے۔ ملک شریف، مولانا دوست محمد ساقی دیوبند سے فارغ التحصیل تھے، عربی کے شاعر اور اسلامیہ ہائی سکول میں مدرس تھے، امین پان فروش، حافظ محمد مڈھا والے مہاجرین میں سے دو نام ہیں ذہن میں ہیں۔ عبدالغنی اور محمد انیس جو بعد میں کراچی جا کر واپس چنیوٹ نہ آئے۔

ایک دفعہ شاہ جی چنیوٹ آئے تو ملک اللہ دتہ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ ملک صاحب کی گفتگو میں کئی دلچسپ واقعات ہوتے تھے۔ شاہ جی نے ملک صاحب سے کہا کوئی دل چسپ بات سناؤ۔ ملک صاحب نے شاہ جی کو اپنے ایک بزرگ کا واقعہ سنایا کہ جب فیصل آباد (لائل پور) نیا نیا آباد ہوا تو وہ بزرگ اپنے بیٹے کو شہر دکھانے لائل پور لے گیا۔ ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہے کہ اچانک اپنے والد سے بچھڑ کر بچہ کہیں گم ہو گیا۔ والد نے اپنے بیٹے کو بڑی پریشانی کی حالت میں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لیکن بچہ نہ مل سکا۔ اب واقعہ یوں ہوا کہ وہ جس بازار سے گزر کر کسی دوسرے بازار کی طرف

جاتا تو اس کے سامنے گھنٹہ گھر آجاتا ایک طرف بچے کی گمشدگی اور دوسری طرف گھنٹہ گھر کے بار بار سامنے آجانے سے اس کے غصے اور پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اسی کیفیت میں اس نے بے ساختہ گھنٹہ گھر کے سامنے کھڑے ہو کر کہا کہ:

''اے گھنٹہ گھر میرے بچے کو تو نے ہی کہیں گم کر دیا ہے۔ تو نے ہی اسے کہیں چھپا لیا ہے۔ میں جب بھی اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں، تو میرے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے اور میرے راستے کی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ تو نہیں چاہتا کہ میرا بیٹا مجھے ملے۔''

ملک صاحب نے یہ واقعہ سنایا تو شاہ جی کو بہت پسند آیا اور تادیر اس سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ رات کو جلسہ گاہ پہنچے تو اپنی پوری تقریر اس واقعہ کے تناظر میں کی۔ پہلے جلسے میں یہی واقعہ سنایا پھر انگریز سامراج کو لائل پور کے گھنٹہ گھر سے تشبیہ دی اور بچے کو اسلام کی عظمتِ رفتہ سے تحریک آزادی کو باپ سے تشبیہ دے کر حالات و واقعات کو اسی استعارے کے گرد گھماتے ہوئے فرمایا:

''ہم ایک مدت سے اسلام کی عظمتِ رفتہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ لیکن راستے کی عظیم رکاوٹ یہی برطانوی سامراج ہے جو ہمارے راستے کو روکے کھڑا ہے۔ ہماری ہر کوشش کو ناکام بنانے کے لیے اپنے پورے وسائل کے ساتھ ہماری راہ میں حائل ہے۔ اگر ہمیں اپنی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کرنا ہے تو پھر اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اپنے پورے وسائل کے ساتھ برطانوی سامراج کے ساتھ ٹکرا جائیں اس کی طاقت کو پاش پاش کر کے رکھ دیں جس کے بعد ہمارا راستہ صاف ہو جائے گا اور اگر اللہ نے چاہا تو ہمارا اپنی منزل تک پہنچنا آسان اور سہل ہو جائے گا۔''

شاہ جی کا یہ معمول تھا کہ وہ دورانِ سفر کسی بھی شہر میں قیام اپنے کسی جماعتی کارکن کے ہاں ہی کرتے۔ شہر کے بڑے بڑے لوگ جب آ کر شاہ جی کو اپنے ہاں آنے یا کھانے کی دعوت دیتے تو فرماتے کہ بھائی میں تو اپنے جماعتی ساتھی کا نام لے کر کہتے کہ ان صاحب کا مہمان ہوں۔ ان سے بات کر لیں اگر اجازت ہوگی تو آپ کے ہاں بھی چلا آؤں گا۔ اس سے پورے شہر میں اس جماعتی ساتھی کی اہمیت میں اضافہ ہوتا اور پورے شہر میں یہ بات پھیل جاتی اور چرچا ہوتا کہ جتنا تعلق شاہ جی کا اس کے ساتھ ہے کسی اور کے ساتھ نہیں۔

ملک اللہ دتہ مرحوم نے کئی مرتبہ مجھے کئی ایسے واقعات سنائے جو میری معلومات میں گراں قدر اضافے کا سبب بھی بنے اور ان واقعات سے میرے دل کے اندر جماعتی محبت میں بھی اضافہ ہوا۔

مولانا گل شیر شہید کے بارے میں ایک واقعہ:

ایک دفعہ ملک صاحب نے مجھے بتایا کہ شہر کی ایک رفاہی اور فلاحی تنظیم ''انجمن اصلاح المسلمین'' کا ہر سال ایک اہم اجلاس دو دن تک شہر میں ہوتا تھا۔ جس میں ملک بھر سے بڑے معروف علمائے دین شامل ہوتے۔ یہ جلسہ شہر کی وجہ

شہرت بن چکا تھا۔ ایک مرتبہ اس انجمن کے صدر اللہ بخش فالودیہ نے مجھے کہا کہ اگر اس دفعہ مولانا گل شیر ہمارے جلسے کو رونق بخشیں تو میری زندگی کی ایک انتہائی اہم خواہش پوری ہو جائے۔ اور یہ کام آپ کر سکتے ہیں کیونکہ وہ آپ کی جماعت کے مرکزی رہنما ہیں اور احرار رہنما اپنے کارکنوں کی بات کو رد نہیں کرتے۔ چنانچہ میرے ایک خط پر مولانا نے جلسہ میں شرکت کا وعدہ کر لیا۔ جلسہ میں جب شامل ہونے کے لیے چنیوٹ پہنچے تو دفتر احرار میں قیام پر اصرار کیا۔ رات کو جلسہ شاہی مسجد میں تھا۔ تقریر کی (میں نے بھی اس تقریر میں اپنے چچا کے ساتھ شرکت تو کی مگر میں اتنا چھوٹا تھا کہ ان کی گود میں ہی سو گیا تھا نہ مولانا کی شکل میرے ذہن میں ہے اور نہ ہی تقریر) جلسے کے دوسرے روز معمول یہ تھا کہ وہ تمام علمائے دین جو جلسہ سے خطاب کرنے کے لیے شہر سے آئے ہوتے۔ شیخ برادری کے امرا اُنھیں ایک پُر تکلف دعوت پر مدعو کرتے۔ چنانچہ مولانا گل شیر شہیدؒ کو بھی دعوت دی گئی جو آپ نے قبول کر لی۔ محلّہ چھریاں کے ڈیرہ چھریاں میں دعوت تھی جب ہم دونوں اس ڈیرے پر پہنچے جہاں دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا تو اتفاق کی بات کہ اس وقت نہ جانے کتنی قسم کے کھانے دسترخوان پر چُنے جا چکے تھے۔ اندر داخل ہو کر مولانا گل شیر شہیدؒ کی نظر جب اس دسترخوان پر پڑی تو ان کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا۔ انہوں نے انتہائی غصے کی حالت میں میری طرف دیکھا اور واپس گلی میں لوٹ گئے مجھے کچھ اندازہ نہ ہوا کہ آپ کی یہ کیفیت کیوں ہوئی۔ میں بھی بھاگ کر ان کے پیچھے چلا لیکن وہ اتنی تیزی میں نکلے کہ مڑ کر انہوں نے پیچھے کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ میں بھی اگرچہ تیز تیز ان کے پیچھے ہی تھا لیکن ان کو روک کر آواز نہ دی کہ آواز دینا ان کے احترام کے منافی خیال کرتا تھا۔ لیکن میری ان کے ساتھ رہنے کی انتہائی کوشش کے باوجود وہ اچانک کسی گلی میں مڑے اور میری نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں حواس باختہ ہوا۔ ایک تو مجھے ان کے اس غصے کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی دوسرے ان کے نظروں سے گم ہو جانے کی پریشانی مجھے بے حال کیے جا رہی تھی۔ ادھر اُدھر بڑا ابھا گا' مگر مولانا کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ سوچا کہ اب دفتر ہی جاؤں کیونکہ ان کی گٹھڑی دفتر میں پڑی تھی۔ بار بار اللہ سے دعا بھی کرتا کہ یا اللہ وہ مجھے مل جائیں ورنہ ان کی ناراضگی کا سبب بھی نہ معلوم ہو سکے گا کجا یہ کہ اس کا تدارک ہو۔ انہی خیالوں میں غرق جب میں دفتر میں پہنچا تو مولانا گل شیر مرحوم ایک روٹی پر پیاز رکھ کر کھا رہے تھے۔ میں ان کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ سلام کیا انھوں نے جواب بھی نہ دیا۔ تاہم حوصلہ کر کے واپسی اور غصّے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا۔

> ''کیا تم میرے مزاج سے واقف نہ تھے کہ مجھے ایک ایسی جگہ پر لے گئے جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی خلاف ورزی ہوری تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تو دو سالن کبھی اکٹھے نہ ہوئے اور تم نے دیکھا نہیں کہ وہاں ایک دسترخوان پر کتنے پر تکلف کھانے چنے ہوئے تھے۔ میں رسول اللہ کی سنت کی خلاف ورزی نہیں کرتا چاہتا تھا یہی میرے غصے کی وجہ تھی اور اسی لیے میں واپس آ گیا۔''

ان کے اس بیان سے میری پریشانی کی ایک وجہ تو ختم ہوگئی کہ وہ کیوں خفا ہوکر وہاں سے نکل آئے۔ بعد میں دست بستہ معافی مانگنے پر انھوں نے معاف بھی فرمادیا۔ آج تک اس بات سے ان کی عظمت کا ایک ایسا نقش دل پہ ثبت ہے کہ اب شاید مرنے کے بعد بھی وہ نہ مٹ پائے۔ اس ایک واقعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے لیڈر دنیادار لیڈروں سے کس قدر مختلف مزاج کے لوگ تھے۔

ملک صاحب کی زبانی ہی معلوم ہوا کہ مولانا ہمارے لیڈروں میں بھی ہر لحاظ سے منفرد تھے۔ رات کو بستر پر نہیں بلکہ مصلے پر یادِ خدا و گریہ میں گزارتے تھے۔ انتہائی موٹا جھوٹا پہنتے تھے۔ سادگی اور درویشی میں اپنی مثال آپ تھے۔ شروع شروع میں احرار کے خلاف تھے۔ احرار رہنماؤں کی تقریر کا تأثر اپنی ایک تقریر کے ذریعے ختم کردیتے تھے اپنے علاقے میں انہوں نے احرار کا رنگ نہ جمنے دیا۔ لیکن جب حج پر گئے تو دعا مانگی کہ اے اللہ میں دین کی خدمت کرنا چاہتا ہوں میری رہنمائی فرما کر کہ کن لوگوں کے ساتھ مل کر دین کا کام کروں۔ وہیں حج کے دوران مکاشفے کے طور خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی آپ نے ارشاد فرمایا کہ احرار کی مخالفت ترک کر کے اسی جماعت میں شامل ہوجاؤ اور دین کی خدمت کرو۔ جس کے بعد مجلس احرار میں شامل ہوگئے اور پھر جماعت میں مقام پر پہنچے کہ جس کا کوئی جواب نہیں۔ احرار کے بالائی نظم نے باقاعدہ فیصلہ کیا کہ جہاں جلسے میں امیر شریعت شامل ہوں وہاں پر مولانا گل شیر شہید کو نہ بلایا جائے اور جہاں مولانا گل شیر کی شمولیت ہو وہاں امیر شریعت نہ شامل ہوں کہ ایک کی تقریر کے بعد دوسرے کی تقریر کی حاجت ہی باقی نہیں رہتی۔ قرآن کی تلاوت مجھے بگوشِ ہوش سماعت کرنے کا شرف تو حاصل نہ ہوا لیکن جنہوں نے ان کو پڑھتے ہوئے سنا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ صرف امیر شریعت کی تلاوت ہی ان کے پائے کی تھی۔ غالباً حضرت امیر شریعت کا ذاتی تأثر بھی ایسا منقول ہے۔

مرادآباد آل انڈیا احرار کانفرنس کا واقعہ:

ایک مرتبہ ملک صاحب نے بتایا کہ مرادآباد میں آل انڈیا مجلس احرار اسلام کا جلسہ تھا۔ ہمارا شرکت کا ارادہ تھا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چنیوٹ کے اسلامیہ ہائی سکول میں ماسٹر خیال مرادآبادی اردو کے معلم تھے جن سے خاصا اچھا تعلق تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اس لیے وہ ان چھٹیوں میں مرادآباد ہی میں گئے ہوئے تھے۔ سوچا کہ قیام ان کے ہاں کر لیں گے اور جلسہ میں شرکت آسان ہوجائے گی۔ چنانچہ وہاں پہنچے تو ماسٹر صاحب کے ہاں ہی ٹھہرے اتفاق یہ تھا کہ گھر جلسہ گاہ کے قریب ہی تھا۔ رات شاہ جی کی تقریر سنی۔ صبح ناشتہ کرتے ہوئے ماسٹر خیال مرادآبادی اور میں دونوں شاہ جی کی رات کی تقریر پر تبصرہ کررہے تھے۔ ماسٹر خیال مرادآبادی کی نانی صاحبہ جو غالباً سو سال کی عمر کی تھیں ہمارا مکالمہ غور سے سن رہی تھیں کہنے لگیں ''رات میں نے بھی اپنے بستر پر تقریر سنی ہے بس ایک بات ہی بار بار ذہن میں آرہی تھی کہ یہ کیسا شخص ہے کہ جس نے ہمارے باپ دادا کی بولی ٹھولی میں پوری تقریر کردی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ یہ مقرر جیسے مرادآباد کا ہی شہری

ہو ہماری مخصوص زبان اور اس کی مادری زبان ہو۔''

شاہ جی کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ جس شہر میں جاتے تھے اسی شہر کہ لب ولہجہ میں تقریر کرنے میں انہیں اچھی مہارت تھی لوگ اس پر خاصے حیران اور متعجّب ہوتے کہ ان کے لیے ایسا کیونکر ممکن ہو گیا تھا۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا چنیوٹ ریلوے اسٹیشن پر استقبال:

ایک واقعہ ملک اللہ دتہ مرحوم ومغفور نے یہ بھی سنایا کہ قیام پاکستان سے صرف چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ شہر میں مشہور ہو گیا کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ بذریعہ ٹرین چنیوٹ شہر کے ریلوے سٹیشن سے گزریں گے اور شہر کے اوباش مسلم لیگیوں نے ان کی توہین کا منصوبہ بنایا ہے۔ میں نے خبر کی تصدیق کی تو پتہ چلا کہ بات درست ہے۔ میں نے ایک دکان سے گھی کا بڑا خالی کنستر اٹھایا اور اس کے ساتھ شہر بھر میں منادی کر دی کہ حضرت مدنی ٹرین سے فلاں وقت ریلوے سٹیشن سے گزریں گے شہر کے لوگ ان کے استقبال کے لیے تشریف لے جائیں۔ غنڈہ گردی کرنے والوں کے لیے مجلس احرار اسلام کے رضا کاروں کا پورا پورا انتظام ہوگا۔ رضا کارانِ احرار ٹرین رکنے پر استقبال کے لیے موجود تھے۔ فضا مولانا حسین احمد مدنی زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ اور ہماری نگاہیں ان منصوبہ ساز شُہدوں کو تلاش کر رہی تھیں لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ ملک صاحب نے بتایا کہ میں نے دو چار منٹ ان کے ڈبے میں جا کر ان سے ملاقات بھی کی اور اپنا تعارف بھی کرایا کہ میں چنیوٹ مجلس احرار اسلام کا صدر ہوں اور میری ناچیز مساعی سے آپ کے استقبال کا اعزاز اہلیانِ شہر کو حاصل ہوا ہے۔ مولانا انتہائی مسرور ہوئے اور میرے گھر کا پتہ لکھ لیا۔ واپس گھر پہنچنے پر مجھے گھر سے شکریے کا ایک خط بھی ارسال فرمایا' جو میری زندگی کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس قسم کے کئی واقعات ان کی ذہنی لائبریری میں بڑی ترتیب کے ساتھ موجود تھے جو وہ اکثر و بیشتر سنایا کرتے تھے۔

سردار بشن سنگھ:

چنیوٹ میں سردار بشن سنگھ نامی تحصیل دار اپنی سرکشی اور منہ زوری کی وجہ سے کافی مشہور تھا۔ شہر کے رؤسا جن میں خاص طور پر محلّہ ٹھٹھی کے سادات قابلِ ذکر ہیں کے ساتھ سردار بشن سنگھ کے خصوصی تعلقات تھے جس کی وجہ سے اس کی سرکشی اور تمرّد میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ کسی بات پر ڈاکٹر عزیز علی ایڈیٹر ہفت روزہ ''یادِ خدا'' اور سردار بشن سنگھ تحصیلدار کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ بات کوئی ذاتی نوعیت کی نہ تھی بلکہ شہریوں کے مفادات کا کوئی معاملہ تھا جسے وہ خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ ڈاکٹر عزیز علی بڑے دھڑلے کے آدمی تھے' اچھی خاصی توں توں مَیں مَیں ہوئی۔ تحصیلدار صاحب نے ٹھٹھی کے سادات سے رابطہ کیا اور کہا کہ اس ڈاکٹر عزیز علی کا کوئی علاج کرو، اس نے تو میری عدالت میں میری بے عزتی کر دی۔ سادات نے کہا کہ یہ کونسا بڑا مسئلہ ہے۔ ہمارے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ چنانچہ ایک دن ڈاکٹر عزیز علی مرحوم ومغفور اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر زین العابدین کے ساتھ ٹھٹھی محلے کسی کام کی غرض سے گئے ہوئے تھے کہ ساداتِ ٹھٹھی کے پالتو غنڈوں ہتّھے چڑھ گئے۔ پولیس چوکی جو اس وقت تھانے میں تبدیل ہو چکی ہے' کے سامنے سڑک پر ڈاکٹر عزیز علی اور ان کے بھائی کو

بُری طرح زدوکوب کیا گیا۔ان کے ہاتھ منہ سوج گئے کپڑے پھٹ گئے،اس حالت میں دونوں بھائی جب واپس شہر آئے تو یہ خبر شہر میں ان سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ جہاں جہاں سے گزرتے گئے دکانیں بند ہوتی گئیں اور پورے شہر میں غم و غصّے کی لہر دوڑ گئی۔ میں ان دنوں خالد بن شہید کے بعد نونہالانِ احرار کا سالار اعلیٰ تھا۔ڈیڑھ دوسو کے قریب ننھے رضا کار میری کمان میں تھے۔میرے ہر حکم کے منتظر رہتے تھے۔ مجھے سالار اعلیٰ (رضا کارانِ احرار) رفیق چنیوٹی نے طلب کیا اور کہا کہ اپنی جماعت کے رضا کاروں کو اکٹھا کر کے شہر میں اس بشن سنگھ کے خلاف ایک احتجاجی جلوس نکالو۔ میں نے لبیک کہا اور ایک گھنٹہ کے اندر اپنے رضا کاروں کو اکٹھا کر لیا۔شاہی منڈی،مجلسِ احرارِ اسلام کا مرکز تھا۔ہم وہاں جمع ہوئے اور اس احتجاجی جلوس کا آغاز کیا۔ ہماری منزل سردار بشن سنگھ کا گھر تھا۔ جو شہر کے دوسرے کنارے ہندوؤں کے سب سے بڑے مندر کے ساتھ ہی واقع تھا۔ہم جس جگہ سے گزرتے وہاں کی فضا ڈاکٹر عزیز علی زندہ باد،بشن سنگھ مردہ باد کے نعروں سے گونج گونج جاتی تھی۔شہر کے ہر بڑے چوک میں ہم گول دائرہ بنا کر سردار بشن سنگھ کا ماتم بھی کرتے۔شہر کے لوگ جو ڈاکٹر عزیز علی کے رفاہی کاموں کی وجہ سے انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے ہر چوک میں ہماری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ بشن کا ماتم کرتے ہوئے اور بشن سنگھ مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے جب ہم بشن سنگھ کے گھر کے قریب پہنچے تو اس کے ملازموں نے ہم پر اپنے پالتو کتے چھوڑ دیے،اس پر جلوس منتشر ہو گیا۔شہر میں ہمارے جلوس سے ہلچل سی مچ گئی۔ ہر جگہ ہمارے جلوس کا ذکر تھا اور ہر کوئی کہہ رہا تھا کہ احراری بچوں نے کمال کر دیا ہے،شہر کی جذبات کی ترجمانی نے کر دی۔

دوسرے دن صبح سویرے شہر میں یہ خبر پھیلی کہ سردار بشن سنگھ مر گیا ہے پہلے تو شہر کے لوگوں نے اسے افواہ سمجھا لیکن تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ واقعتاً سردار صاحب واصلِ جہنم ہو گئے ہیں۔ ہوا یہ کہ ہمارے اس جلوس کے فوراً بعد اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ قے اور اسہال یکدم شروع ہوئے رات تک حالت نازک ہو گئی تو لائل پور ہسپتال لے جایا گیا لیکن سنبھل نہ سکا اور گزر گیا۔لوگوں کا تبصرہ تھا کہ معصوم احراریوں کی بد دعائیں اسے لے بیٹھیں۔شہر میں اس بات کا کافی دنوں چرچا رہا کہ بچوں کی بد دعائیں کتنی تیزی سے رنگ لائیں کہ تُند خو اور سرکش چند گھنٹوں میں موت سے ہمکنار ہو گیا۔

ڈاکٹر عزیز علی کے ادارہ کے ایک کاتب علی محمد ان کے صرف کاتب ہی نہ تھے بلکہ بھائیوں جیسا تعلق رکھتے تھے۔ وہ ''یادِ خدا'' کی کتابت کے ساتھ ساتھ دن رات ڈاکٹر عزیز علی کی اس توہین پر کڑھتے رہتے تھے۔انہوں نے بھی کہا کہ جب تک اس بے عزتی کا بدلہ نہیں لوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے گاؤں سے لٹھ بند دیہاتیوں کو بلوایا جنہیں ہر روز اندرون والی مسجد میں ڈاکٹر زین کی دکان کے اندر بٹھا دیا جاتا اور کچھ آدمیوں کو شہر میں اس بات کا پتہ لگانے کے لیے بھیج دیا جاتا کہ وہ دیکھیں کہ ٹھٹھی کے غنڈوں میں سے کوئی فرد شہر میں تو نہیں ہے،دو روز کے بعد پتہ چلا کہ ٹھٹھی والوں کا ایک اہم فرد غالباً اس کا نام ''شبیر شاہ'' تھا اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ شہر میں دیکھا گیا ہے بس پھر کیا تھا کاتب علی محمد کی یہ فوج ظفر موج فوراً اس جگہ آ گئی جہاں آج کل راحت بیکری کی دکان ہے وہاں انہوں نے شبیر شاہ اور اس کے ساتھیوں کو

گھیر لیا۔ ڈاکٹر صاحب کو پتہ چلا تو وہ بھی جلدی جلدی وہاں پہنچ گئے اور اپنے لٹھ بند دوستوں کے درمیان کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ آپ میں سے کوئی شخص ان کو نہیں مارے گا۔ میں اپنا بدلہ خود اپنے ہاتھوں سے لوں گا۔ چنانچہ ڈاکٹر عزیز علی نے خود ان تین چار لوگوں کو جن میں ان کا سر کردہ ایک سید بھی تھا جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو مار کر زخمی کر دیا کی خوب دھنائی کی۔ یہ لوگ شہر سے مار کھا کر جب بھٹھی پہنچے تو یہ خبر سنتے ہی وہاں کے لوگ آگ بگولہ ہو گئے اور تقریباً سو دو سو کے لگ بھگ ایک مشتعل جلوس کی صورت میں شہر کی طرف چل پڑے۔ کسی کے پاس لاٹھی تو کسی کے پاس کلہاڑی اور بلم، کچھ مسلح اور کچھ غیر مسلح۔ چوک قصاباں میں جو آج کل شہید چوک کہلاتا ہے آ کر محلّہ کے رہنے والے قصابوں کو ماں بہن کی گالیاں دے کر للکارتے رہے۔ اس لیے کہ محلّہ کے قصائی' ڈاکٹر صاحب کی عوامی خدمات کو شہر کے دوسرے لوگوں کی طرح دل و جان سے چاہتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ بہر حال یہ چوک میدانِ جنگ بن گیا لاٹھیوں کی ایک زبردست جنگ شروع ہو گئی ایک قصائی نوجوان ''ممّوں بوڑی دا'' جس نے ایک خاص لاٹھی جو تیل میں بھگو کر تیار کر رکھی تھی اور وہ دریا پر ریت کے اوپر لٹھ چلانے کی مکمل تربیت بھی حاصل کر چکا تھا جب اس جنگ میں آیا تو اس وقت تک دونوں طرف سے سات آٹھ آدمی زخمی ہو کر گر چکے تھے۔ جب اس نے لٹھ چلانی شروع کی لٹھ کی آواز ایک عجیب سی گونج پیدا کر رہی تھی اور اس گونج میں ایک ہیبت بھی تھی۔ چند ہی منٹوں میں اس ایک آدمی نے بھٹھی سے آنے والے پورے لشکر کو آگے لگا لیا اور میدان سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ زخمی زمین پر پڑے تھے جن میں ایک زخمی احسان الٰہی احرار کارکن بھی تھا۔ اِدھر یہ جنگ جاری تھی اُدھر ڈاکٹر صاحب اپنا کارنامہ سرانجام دے کر واپس گھر جا رہے تھے، لیکن اس جنگ سے ابھی تک بے خبر تھے میں بھی ان ہی لوگوں کے ساتھ تھا۔ اتنے میں میرے چچا جاوید منیر احمد ہمارے پیچھے بھاگتے ہوئے آئے اور کہنے لگے ''او بھائیا جی واپس آؤ' اُدھر بھٹھی والے مسلح ہو کر آ گئے ہیں اور چوک قصاباں میں ان کی قصائیوں کیساتھ زبردست لڑائی ہو رہی ہے، کئی لوگ زخمی ہو گئے ہیں'' اس پر ڈاکٹر عزیز علی اپنے لٹھ بند ساتھیوں کے ہمراہ واپس بھاگے تا کہ اس لڑائی شرکت کر سکیں۔ ڈاکٹر صاحب خود ان کے ساتھ بھاگ بھی رہے تھے اور انہیں کہہ بھی رہے تھے کہ آہستہ آہستہ بھاگو سانس پھول گئی تو پھر لاٹھیاں کیسے برساؤ گے۔ ابھی ہم صرافہ بازار میں چنیوٹیوں والی مسجد کے قریب ہی آئے تھے کہ لوگوں نے ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو روک لیا کہ اب لڑائی ختم ہو چکی ہے اور پولیس موقع واردات پر پہنچ کر اپنی کاروائی کر رہی ہے، آپ وہاں نہ جائیں معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ زخمیوں کو ہسپتال داخل کرا دیا گیا۔ بعد میں مقدمہ کی نوبت بھی آئی لیکن سادات نے ڈاکٹر صاحب سے معافی مانگ لی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ لیکن اس واقعہ سے ڈاکٹر عزیز علی کی دھاک شہر کے دوسرے افسروں پر بیٹھ گئی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ جرأت کے ساتھ شہریوں کے مسائل کے لیے شہر کے افسران کے ساتھ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے میں زیادہ مستعد ہو گئے اور شہری مسائل میں افسران کا تعاون بہتر ہو گیا۔ (جاری ہے)